ضرورت العمل فی الدین

(احکامِ دین پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	خطبۂ ماثورہ	۷
۲	تمہید	۷
۳	ضرورتِ شیخ	۹
۴	مسئلہ کا جواب کس طرح سے دیا جائے	۱۰
۵	حضرت تھانویؒ کا مربّیانہ جواب	۱۱
۶	علمِ الفاظ ومعانی	۱۲
۷	قرآن کریم کے الفاظ کی تصحیح کی ضرورت واہمیت	۱۳
۸	حرف ''ض'' کی درست ادائیگی کا طریقہ	۱۵
۹	ایک ماہ میں قرآن کی تصحیح کا طریقہ	۱۷
۱۰	تجوید نہ سیکھنے کا نقصان	۱۸
۱۱	تلاوت قرآن میں لب ولہجہ کی ضرورت واہمیت	۱۸
۱۲	قرآن کو عمدہ لہجے میں پڑھنے کا لطف	۱۹

۱۳	علم دین سیکھنے کی ضرورت	۲۰
۱۴	قوانینِ قرآن	۲۱
۱۵	عوام کی غلط فہمی	۲۱
۱۶	ہر شخص کو قرآن کے معنی بیان کرنے کی اجات نہیں	۲۲
۱۷	سلف و صالحین کے مقابلے آج کل کے اسکالرز کی تفسیر کا حال	۲۳
۱۸	سلف صالحین اور آج کل کے اسکالرز برابر نہیں ہوسکتے	۲۴
۱۹	مفسرین کی تفسیر کے خلاف کسی جدید محقق کی رائے کا اعتبار نہیں	۲۵
۲۰	قرآن پاک کی تفسیر سمجھنے کے لئے اصول سے واقف ہونا ضروری ہے	۲۵
۲۱	آج کل کے عقلاء کے دلائل کی حقیقت	۲۷
۲۱	تہذیب کی حقیقت	۲۷
۲۳	ایثار کی کمی	۲۸
۲۴	تہذیب اخلاق کا منشاء	۲۸
۲۵	علت اور حکمت میں فرق	۲۹
۲۶	احکامِ الٰہی کی علتیں پوچھنا	۳۰

۲۷	اللہ تعالیٰ کی محبت کا مقتضیٰ	۳۰
۲۸	لوگوں کے شبہات کے جوابات	۳۱
۲۹	احکام شریعت میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ	۳۲
۳۰	جہاں چھ ماہ کا دن چھ ماہ کی رات ہو وہاں نماز کس طرح پڑھیں گے	۳۳
۳۱	شب قدر کی فضیلت پر شبہے کا جواب	۳۵
۳۲	شبہات کی وجہ	۳۵
۳۳	ایک دن میں پانچ نمازیں کیوں فرض ہیں اس شبہہ کا جواب	۳۶
۳۴	حضرات صحابہؓ کی عقل و فراست کی دلیل	۳۶
۳۵	سلامتی کی راہ	۳۷
۳۶	احکامِ دین میں ترامیم پیش کرنے کی وجوہ	۳۷
۳۷	اپنے ایمان کی حفاظت کرو	۳۸
۳۸	پردے کو راحت سمجھو	۳۸
۳۹	سود کو حلال سمجھنے سے بھی ترقی نہ ہوگی	۳۹
۴۰	قربانی پر شبہہ کا جواب	۳۹
۴۱	جان کا نذرانہ	۴۰

۴۲	عمدہ جانور کا انتخاب	۴۱
۴۳	احکام دین میں علماء کی تقلید کرو	۴۲
۴۴	آج کل قوتِ اجتہادیہ کسی میں نہیں	۴۲
۴۵	ہر ایک کو مولوی بنانا مناسب نہیں	۴۳
۴۶	نااہل کو مولوی بنانے کا نقصان	۴۴
۴۷	مولویت کے لئے انتخاب صحیح کی ضرورت	۴۵
۴۸	تربیت کا فائدہ	۴۶
۴۹	استاذ کے لئے مرّبی ہونا ضروری ہے	۴۶
۵۰	علماء کی معاش کا انتظام	۴۷
۵۱	علماء کی معاش کے لئے عالمگیر کی حسنِ تدبیر	۴۷
۵۲	غیر مولویوں کو تعلیم دینے کا طریقہ	۴۸
۵۳	اَن پڑھ جہلاء کی تعلیم وتربیت کا طریقہ	۴۸
۵۴	عورتوں کی تعلیم	۴۹
۵۵	ظاہر و باطن کی اصلاح	۴۹
۵۶	تصوف کی حقیقت	۵۰
۵۷	خلاصۂ وعظ	۵۱

وعظ

ضرورت العمل فی الدین

(احکامِ دین پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ وعظ ۷ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو بعد نمازِ عشاء الہ آباد میں عبدالباقی خان صاحب کے مکان میں تقریباً ۳ گھنٹے کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی جن میں مستورات کا مجمع بھی تھا۔

مولوی سعید احمد صاحب تھانویؒ نے اسے ضبط فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولٰنا محمدًا عبدہ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(۱) ”اے رب ہمارے! اور بھیجئے ان میں ایک رسول جو انہیں میں سے ہو پڑھے ان پر آیتیں آپ کی اور سکھاوے ان کو کتاب آپ کی اور حکمت اور پاک کرے ان کو آپ قدرت والے ہیں حکمت والے ہیں“۔

تمہید

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل پڑھی گئی تھی دو مجلسوں میں اس کی تلاوت ہوئی ہے مجلسِ اول میں اس کے متعلق تمہید عرض کی گئی تھی اور مجلسِ دوم میں ایک جز کی یعنی بحث الفاظ کی زیادہ تفصیل اور دوسرے جز کی یعنی علمِ معانی کی قدرے تفصیل کی گئی تھی۔ تیسرا جز یعنی عمل باقی تھا اُس کی تفہیم اور دوسرے جز کی تتمیم کے

(۱) سورۃ البقرہ: ۱۲۹۔

لئے یہ وقت تجویز کیا گیا یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اس کے قبل یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے تین جز کا بیان کیا ہے یَتْلُوْا اور یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور یُزَكِّيْهِمْ اور یہ تینوں سب دین کے جز ہیں۔ دین کی ضرورت اس سے پہلے بیانوں میں ثابت کردی گئی تھی اس کے اعادے کی ضرورت نہیں اور اس کے تین جز ہیں سے یَتْلُوْا کے متعلق تحصیل الفاظِ قرآنیہ کا مضمون بھی اس کے قبل بیان کیا جاچکا ہے پس اس وقت صرف جزعملی کا بیان ہوگا باقی محض مضامینِ سابقہ کا مختصراً اعادہ بطورِ استحضار تمہید کے مکرر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مقصود میں خواہ وہ ادنیٰ درجے کا ہو یا اعلیٰ درجے کا ہو دو جز ہوتے ہیں ایک جز علمی اور ایک جز عملی مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اول ہمیں اس کا علم ہوگا پھر اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے۔ یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اس کو کہیں گے جس کو علمِ ادویات بھی ہو اور ان کا استعمال بھی جانتا ہو۔ اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہ ہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصدِ عُلیا (۱) سے ہے اس لئے اُس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے۔ اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ دال کا ہوا کرتا ہے اور ایک مرتبہ مدلول (۲) کا۔ سو جس طرح تقسیم الی الجزئین (۳) ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں اسی طرح دال و مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصود علمی میں ثابت ہوگا اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی۔ مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں معانیٔ مقصودہ پر ان کے بغیر ان معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے۔

---

(۱) بلندترین مقاصد میں سے ہے (۲) ایک درجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ ان معنی پر دلالت کرتے ہیں دوسرا درجہ یہ ہے کہ یہ معنی ان الفاظ سے ماخوذ ہیں (۳) جیسے ہر مقصود دو اجزاء میں منقسم ہوتا ہے۔

ضرورتِ شیخ

یہاں سے الفاظ کے دال علی المعانی اور کافی فی الد لا لة (۱) ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی کہ وہ اہل باطن کے لئے بہت مناسب ہے چونکہ مجمع میں اس قسم کے لوگ بھی ہوں گے اس لئے اُس کا ذکر مفید ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض اہلِ باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت و حرارت عبادت میں کسی قسم کی لذت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامل ہو گئے حالانکہ تکمیل اس کو کہتے ہیں جسے اہلِ فن تکمیل کہہ دیں۔ بچہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوگیا' حالانکہ علم سے ابھی اس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی ہاں جب اہلِ علم یہ تجویز کر دیں کہ اب یہ عالم ہوگیا ہے اس وقت کہا جائے گا کہ اس کو کمال فی العلم ہوگیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آ گئی تھی کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا (۲) ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذرا سی قلب کی حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے۔

بہرحال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہلِ فن تکمیل سمجھیں۔ تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہو جائے تو دوسرے سے رجوع نہیں کرتے بالخصوص اگر کشفِ قبور ہی ہو کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشفِ قبور کے لئے صاحب نسبت فنا ہونا ضروری ہے تو جب صاحبِ نسبت بھی ہو گئے پھر کیا کسر رہی؟ حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں ہے نہ مطلق نسبت کا حصول دلیلِ کمال

(۱) یہ الفاظ ان معنی پر دلالت کرتے ہیں اور ان معنی کے سمجھنے کے لئے یہ الفاظ کافی ہیں (۲) تھوڑے سے ہنر پر اپنے آپ کو کامل سمجھنا۔

ہے۔ کشفِ قبور کے نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک محقق کی حکایت یاد آئی کہ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں' فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے اس شخص نے کہا مثلاً میں ہوں' فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا بڑا مسئلہ اور کس طرح دو جملوں میں حل کر دیا۔

مسئلہ کا جواب کس طرح سے دیا جائے

یہ بات اہلِ علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ ان کو جواب میں سائل کے تابع ہر گز نہ ہونا چاہئے اور جو طرز جواب کا ان کے لئے مصلحت ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے گو وہ ان کے رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اسی راہ چلیں' جس طرح اس حکایت میں سائل نے تو یہ چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اس کو بے کار سمجھ کر ان کی حالت کے مناسب جواب دیدیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق جس قدر مسئلے سے ہے اس کو سمجھ لو کہ تم کو قبور سے نفع نہیں ہوسکتا۔ پس سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ ہم لے چلیں اس راہ اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا ورنہ ہم سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا مجیبوں نے جب دیکھا کہ ان کی یہ حالت ہے تو جس چال انہوں نے چلایا اسی چال انہوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سائلین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ جس کو مرض دِق (۱) بھی ہو اور زکام بھی ہو اور جا کر حکیم سے فرمائش کرے کہ اول زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدید مدّت (۲) صرف کر دے تو وہ خائن ہے۔ اس

(۱) ٹی بی کا مرض (۲) طویل مدت۔

کو چاہئیے کہ مریض کو رائے دے کہ ہرگز ایسا نہ کرو اول دِق کی خبر لو اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اس وقت کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر بھی اپنی ہی تجویز اور اُس کی مصلحت پر عمل کرے گا اور اگر اس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خودغرض ہے۔ اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق' سوال میں جتنا ناشائستہ جز ہو اس کو نکال دے اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اتنا جواب دے۔

حضرت تھانویؒ کا مربّیانہ جواب

مجھے یاد آیا کہ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو ان کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مدلّل جواب دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا ان کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے؟ یہ اس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں (۱) یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے۔ اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا میں نے کہا بیشک میں نے نہیں پہچانا کہنے لگے کہ میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں دیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جواب کو ابھی تک نہیں

(۱) اور سود لینا چونکہ قطعی حرام ہے اس لئے کافر سے بھی جائز نہیں۔

سمجھے تو میں نے اُن کی سمجھ کے موافق اس استفسار(۱) کا ایک دوسرا جواب دیا میں نے کہا کہ آپ ایک عہدیدار ہیں آپ کو ہر قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب(۲) کے ساتھ دوسری قسم کا' کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیحدہ برتاؤ ہوتا ہے میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو افتاء کا بھی ایک محکمہ ہے اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا' میں چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا۔ اس لئے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اب انشاء اللہ تعالیٰ اس قسم کا جواب نہ آئے گا لیکن اس ملاقات کا جیسا اثر مجھ پر ہوگا آپ پر بھی ہوگا آپ کے پاس سے بھی اس قسم کا لغو(۳) سوال کبھی نہ آئے گا۔ غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہوجاتے ہیں مگر ان محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں ہوتا مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت فنا کو ہوتا ہے خیر یہ حکایت تو تبعاً بیان ہوگئی۔

علمِ الفاظ ومعانی

اصل بیان اس کا ہے کہ طالب اگر صاحبِ کشف بھی ہوجائے تب بھی اس کو شیخ سے استغناء (۴) جائز نہیں کیونکہ اس میں کفایت نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک بدلالتِ لفظیہ یعنی تعلیم وتلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبتاً(۵) افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور ممد ہے (۶) پس صرف

(۱)اس سوال کا دوسرا جواب دیا (۲) ناواقفوں کے ساتھ (۳) بے ہودہ سوال (۴) شیخ کی راہنمائی سے بے نیاز نہیں ہوسکتا(۵) شیخ سے دو قسم کا فیض ہوتا ہے ایک اس کے کلام سے کہ جو تلقین اور تعلیم دین کا ذریعہ بنتا ہے دوسرے ان کی توجہ سے کہ اس سے نسبت قوی ہوتی ہے(۶) فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے میں اس کے الفاظ کا سننا یا پڑھنا زیادہ مفید ہے۔

قبور سے استفادے پر بس (۱) کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالتِ موجودہ میں ترقی ہوتی ہے (۲) وبس' بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہہ ہو تو اس کو پیش کر کے حل کر سکتا ہے خوب مشبع طور (۳) سے تو اس کے برابر ہرگز فیضِ قبور نہیں ہو سکتا یہ اس کی فرع تھی کہ الفاظ کے برابر افادہ نہیں ہو سکتا یہ ہی میں نے اجمالاً بیان کیا تھا پس علم کے متعلق دو جز ہوئے الفاظ اور معانی اور تیسرا مقصود عمل ہوا یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ میں نے بیان کر دیا تھا کہ الفاظ کے متعلق کافی بحث ہوگئی ہے اور چونکہ اور علوم میں الفاظ کی ضرورت مقصود نہیں ہے اس لئے اُس میں اردو وغیرہ نفسِ مقصود کے حصول میں سب برابر ہیں اور قرآن شریف میں بخصوصہا الفاظ بھی مقصود (۴) ہیں اس کو خوب بیان کر دیا تھا۔

قرآن کریم کے الفاظ کی تصحیح کی ضرورت و اہمیت

البتہ الفاظ کے متعلق ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی وہ اب بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ الفاظ کے کچھ حقوق ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنی ہیئت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محفوظ رہیں کیونکہ عربیت ایسی ہی ہے جیسے اردو' سو اگر اردو کے قواعد پر رہے تو وہ اردو کہلائیگی ورنہ نہیں' جیسے آج کل تشبّہ کے لئے اردو غلط بولنے لگے ہیں ظاہر ہے کہ وہ اردو نہیں ہے میں نے خود اسٹیشن کانپور پر دیکھا کہ ہندوستانی شخص نے اردو کو خراب کر کے ایک شخص سے کہا کہ ''ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا'' اور صحیح اردو کا چھوڑنا محض اس نیت سے کہ انگریزوں سے تشبّہ ہو۔ افسوس ہے کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہم کو اردو آجائے اور ہم اس کوشش میں ہیں کہ جو کچھ آتی ہے وہ

(۱) صرف قبروں سے فیض لینے پر کفایت کرنا درست نہیں (۲) قبروں سے فیض میں صرف نسبت قوی ہوتی ہے
(۳) اگر کوئی شبہہ ہو تو اس کو خوب اچھی طرح شیخ زندہ سے حل کر سکتا ہے بخلاف شیخ کی قبر سے فیض لینے کے
(۴) قرآن پاک کے الفاظ بھی مقصود ہیں۔

بھی خراب ہو جائے، میں نے پہلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ تو ہماری چیزیں لیتے جاتے ہیں اور ہم ان کی چیزیں اختیار کرتے جاتے ہیں یہ بھی اسی کا ایک شعبہ ہے کیا انتہا ہے کہ الفاظ میں بھی باوجود اختیار اور قدرت کے ان کے موافق ہونے کی کوشش کی جاتی ہے غرض جیسے یہ اردو نہ تھی اسی طرح اگر عربی کو بگاڑ کر پڑھا جائے تو وہ عربی نہ ہوگی۔ اس وقت جو لوگ قرآن شریف کے پڑھنے کی طرف توجہ کرتے ہیں وہ بھی اُسکی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اکثر علماء کو بھی اس کا خیال نہیں ہے حالانکہ اس پر توجہ نہ کرنے سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں، قرآن شریف میں تین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں بس ایک تو وہ کہ جن کو عوام بھی سمجھتے ہیں دوسرے وہ جن کو خواص سمجھتے ہیں تیسرے وہ جن کو خواص الخواص سمجھتے ہیں، اس کی ایک مثال اردو میں پیش کرتا ہوں مثلاً لفظ پنکھا بولتے ہیں تو نون کے بعد کاف ہے اور نون ساکن ہے لیکن نون کو اس کے مخرج سے نہیں نکالتے بلکہ اُس کو خیشوم (۱) سے نکالا جاتا ہے اس کو سب جانتے ہیں اس کو اصطلاح میں اخفاء کہتے ہیں یہ اظہار اور ادغام کے بین بین ہوتا ہے تو پنکھا میں نون اخفا کے ساتھ ہو، تو اگر کوئی یہاں اظہار کرے یعنی نون کو اُس کے مخرج سے نکالے اس طرح پَنْ تو سب ہنسیں گے اور اس کو اردو نہ کہیں گے اس لئے کہ اخفاء نہیں کیا، تو معلوم ہوا کہ اگر قواعد سے زبان ہے تو اصلی ہے ورنہ نہیں، بس اسی طرح عربی زبان میں بھی ہے مثلاً موقع اخفاء میں اخفاء واجب ہوگا جیسے پنکھا اظہار کے ساتھ غلط ہے اسی طرح عربی میں بھی اگر اخفاء کی جگہ اخفاء نہ ہوا تو لفظ غلط ہے کتنی موٹی بات ہے مگر اس کو کوئی نہیں سمجھتا تو جیسے پنکھا اظہار سے اردو نہ رہے گا اسی طرح عربی لفظ بھی اخفاء کی جگہ اظہار کرنے سے عربی نہ رہے گا اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا﴾ (۲) تو جب قرآن عربی میں ہے

(۱) ناک کے بانسہ سے نکالا جاتا ہے (۲) سورۂ یوسف: ۲۔

اور تجوید کے خلاف کرنے سے عربی نہ رہے گا تو قرآن عربی میں نہ پڑھا، عاقل کے لئے یہ تقریر بالکل کافی ہے میں نے علماءِ قراءت کے اقوال اس لئے نقل نہیں کئے کہ لوگ ان کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک مثال دے دی جس کو سب مانتے ہیں اور یہ مثال نمونے کے طور پر بتلادی ہے اسی طرح بہت سے قاعدے ہیں۔

حرف ''ض'' کی درست ادائیگی کا طریقہ

مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کثرت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ہے یا وَلَا الظَّآلِّیْنَ لیکن اس کے سیکھنے کیطرف توجہ نہیں کی جاتی جو کام تلفظ کا ہے اُس کو کتابت سے نکالا جاتا ہے حالانکہ تلفظ کا کام کتابت سے کیسے ادا ہو کتابت میں تو صرف صفات آسکتے ہیں باقی جو امور مُدرک بالسمع (۱) ہیں وہ کس طرح کتابت میں آجائیں گے کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

''اگر مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر لوگوں کے دلوں کو کھینچ لے گی لیکن میں حیران ہوں کہ اس محبوب کے نازو انداز کس طرح دکھائے گا''

اگر محبوب کی تصویر مصوّر بنا بھی لے گا تو اس کے نازو ادا کو کیونکر دیکھا جائے گا تو اگر ''ض'' کی صفات لکھ کر بھیجدے تو اس کے ادا کرنے کی کیفیت تو نہیں لکھ سکتا۔ کوئی فوٹو گراف تو نہیں کہ اس کو بھیجدیا جائے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک قاری بھیجدیا جائے تو خیر۔ غرض یہ سخت غلطی ہے کہ کتابت سے کام نکالنا چاہیں بلکہ آکر سیکھنا چاہیئے۔ تو تجوید کی ضرورت ثابت ہوگئی اور بدوں اس کے جس طرح آپ جاہلوں کو غلط بولتے دیکھتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں اسی

(۱) جن چیزوں کا تعلق سننے سے ہے ان کی تصحیح سنکر ہی ہوسکتی ہے لکھنے سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

طرح مجوّ دین(۱) آپ پر بھی ہنستے ہیں مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مدنی لکھنؤ میں آئے اور انہوں نے قرآن سُنایا ہندوستانی ذہین تو ہوتے ہیں ایک لڑکے نے اُن کی قراءت کا چربہ(۲) اُتارا لوگوں نے اُس کو خوب مشق کرائی اور جب اپنے نزدیک وہ قاری صاحب سے افضل ہوگئی تو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے قاری صاحب کے پاس اُس لڑکے کو لے گئے اور کہا کہ اِسنے کچھ تبرکاً آپ کا اتباع کیا ہے انہوں نے کہا کہ ہاں سنایئے چنانچہ لڑکے نے سنایا جب سنا چکا تو یہ لوگ داد کے منتظر ہوئے قاری صاحب نے کچھ نہ کہا' تو خود ہی پوچھا کہ اس نے کیسا پڑھا؟ قاری صاحب نے کہا کہ ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک لغات اردو بنایا ہے کہ (اَلْحِمَارُ) ککری (اَلْحَطَبُ) لکری (اَلْعَنْکَبُوْت) مکری(۳) اس وقت حقیقت معلوم ہوئی کہ کیسا قرآن صاحبزادے نے پڑھا ہے(۴)۔ دیکھئے اگر کوئی شخص ککری اور لکری کہنے لگے تو کیا اس کو اردو بولنے والا کہیں گے ہرگز نہیں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی مہاجر مکی سے ایک عربی نے کہا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے عرب میں رہتے ہیں لیکن اب تک عرب جیسا قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے انہوں نے کہا کہ غیر زبان میں اہلِ زبان کی سی مہارت نہیں ہوسکتی' کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہوسکتی آخر ہم اردو بولتے ہیں' انہوں نے کہا کہ آپ ہرگز اہل زبان کے برابر نہیں بول سکتے اور اگر بول سکتے ہیں تو کہیئے ''ٹٹو'' ''ٹھٹھا'' ان بیچارے نے کہا تو ''تتو'' ''تتا'' ہی نکل سکا مگر یہ تو دفع الوقتی تھی وہ لوگ تو اس کے مکلّف نہیں کہ اردو صحیح بولیں اور ہم تو مکلّف ہیں قرآن صحیح پڑھنے کے۔

---

(۱) جو لوگ فن تجوید و قراءت سے واقف ہیں (۲) قراءت کی نقل اتاری (۳) دونوں حروف پر زبر پڑھے (۴) انہوں نے بتادیا کہ کہ جیسے اردو میں ''ڑ'' کی جگہ ''ر'' پڑھے تو غلط ہے اسی طرح اس نے بھی قراءت غلط کی ہے۔

ایک ماہ میں قرآن کی تصحیح کا طریقہ

مگر خدا کا شکر ہے کہ اب چند روز سے علماء نے اس پر توجہ کی ہے مدارس میں قُرّاء بھی نوکر رکھے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سب ادھر متوجہ ہوں اور کچھ لہجے کی ضرورت نہیں صرف حروف کو صحیح کرلینا چاہئیے اور اس میں کچھ زیادہ مدت نہیں لگے گی صرف اٹھائیس حروف ہیں اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ ان کی مشق کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض حروف کی مشق کی ضرورت ہے جیسے (ںؔ، طؔ، زؔ، ضؔ، ظؔ، ذؔ) کی ترقیق تفخیم (۱) تو اگر ایک ایک حرف کے لئے تین تین دن لئے جائیں تو ایک ماہ سے زیادہ صَرف نہ ہوگا اور قرآن شریف صحیح ہوجاوے گا' رہے محسنات (۲) سو ان کو سیکھنا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں نیز سارے قرآن کو سیکھنے کی ضرورت نہیں قواعد کے موافق اگر تھوڑا بھی پڑھ لیا جائے تو کافی ہے پھر سب خود صحیح ہوجائے گا ہاں کسی استاد سے پیش کرنا سارے قرآن شریف کا ضروری ہے اور یہ مضمون بہت ہی ضروری ہے اس کی طرف علماء کو بالخصوص توجہ کرنا چاہئیے۔ اس وقت اگر پچاس مولویوں کو جمع کر کے قرآن شریف سنا جائے تو بمشکل دو آدمی صحیح قرآن شریف پڑھنے والے نکلیں گے کتنے افسوس کی بات ہے کہ طلباء فلسفہ پڑھتے ہیں منطق پڑھتے ہیں اور رأس العلوم قرآن شریف کو نہیں پڑھتے (۳)۔

---

(۱) باریک اور موٹا پڑھنا (۲) عمدگی کے ساتھ تمام صفات لازمہ عارضہ کا خیال رکھ کر قواعدِ تجوید کی رعایت کرتے ہوئے حسنِ آواز سے پڑھنا (۳) تمام علوم کی اصل قرآن کو نہیں پڑھتے۔

تجوید نہ سیکھنے کا نقصان

اور پھر غضب یہ کہ ایسے لوگ امام ہو جاتے ہیں اور اس میں دنیوی خرابی یہ ہے کہ بعض اغلاط پر عوام بھی مطلع ہو جاتے ہیں اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں ایک صاحب نے سورۂ ناس میں مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّسُ پڑھا' ایک صاحب نے سورۂ ابی لہب میں تبَّتُ یَدَآ اَبِیُ لَحَبُ پڑھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضور اتنے بڑے عالم ہو کر غلط پڑھتے ہیں کہنے لگے کس طرح پڑھوں؟ ان صاحب نے آہستہ سے بتلایا کہ ﴿اَبِیُ لَهَبُ﴾ آہستہ اس لئے بتلایا کہ کوئی سنے نہیں ناحق کی رسوائی ہے تو وہ بزرگ اس آہستگی ہی کو مقصود سمجھ کر فرماتے ہیں۔ ہاں زور سے نہ پڑھا کروں ہلکے سے پڑھا کروں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ سمجھانے پر بھی نہ سمجھے بات یہ ہے کہ بلا حاصل کئے ہوئے کچھ آتا نہیں۔

تلاوت قرآن میں لب ولہجہ کی ضرورت واہمیت

دیکھئے آجکل اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریزوں کا لب ولہجہ آجائے اور اس کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کوئی اپنی اولاد کو لندن بھیجتا ہے کسی نے اپنے بچوں کو میموں کے سپرد کر دیا ہے حالانکہ اس پر نہ پاس ہونا موقوف ہے نہ ڈگری' لیکن باوجود اس کے اس کی طرف تو اتنی توجہ کہ اس کے صرف پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں بلکہ لب ولہجہ حاصل کرنے کی بھی تمنا اور کوشش ہے اور قرآن شریف کو ایسا چھوڑا جائے کہ اول تو پڑھا ہی نہ جائے اور اگر پڑھیں بھی تو یوں خراب کر کے۔ صاحبو! اگر قرآن شریف کو ہم چھوڑ دیں تو بتلایئے کہ پھر اور کون اس کو پڑھے گا۔ ہر شخص کو قرآن شریف اس طرح پڑھنا چاہیئے کہ معلوم ہو کہ حضور ﷺ

کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ واللہ اس میں ایسی لذت ہے کہ اگر ادراک میں تھوڑی سی صحت ہو تو ساری تغنّی ایک طرف اور تلاوت قرآن شریف ایک طرف[۱]۔

قرآن کو عمدہ لہجے میں پڑھنے کا لطف

ایک بزرگ تھے مولوی کرامت علی صاحب انہوں نے قرآن شریف عرب میں سیکھا تھا۔ ایک مغنّی نے ان کو پڑھتے سنا اور کہا اس سے اچھی بھیرویں میں نے آج تک نہیں سنی۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں کیا جانوں بھیرویں[۲] کیا ہوتی ہے؟ کہنے لگا آپ کو خبر نہیں کہ یہ بھیرویں ہے۔ تو قرآن شریف ایسی عجیب چیز ہے کہ ہر لہجے میں ڈھل جاتا ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب کو خبر بھی نہیں مگر اس مغنّی کو اس کے مذاق کے موافق لطف آیا۔

بہارِ عالمِ حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگِ اصحاب صورت را بو ارباب معنیٰ را

''اس عالم کی دلکش بہار دل و دماغ کو تازہ کر دیتی ہے' اصحاب صورت کے رنگ معنی ادا ہو جاتے ہیں''

کبھی مکہ معظّمہ جانا ہو تو دیکھئے گا کہ ہر گوشے سے کیسی پیاری پیاری آوازیں آتی ہیں واللہ انسان محو ہو جاتا ہے اور ہم کو جو مزہ نہیں آتا تو اس لئے کہ ہم کو پڑھنا آتا نہیں ورنہ صحیح پڑھنے والوں کو خود مزہ آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی تو خاصیت یہ ہے ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ [۳] ''قرآن سن کے تو ان اللہ سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں'' اور ہم میں یہ اقشعرار[۴] ہے نہیں تو کیا بات ہے' کچھ تو قلوب ہی درست نہیں کچھ غلط پڑھنے کی

(۱) اگر انسان کا فہم صحیح ہو تو سارا گانا بجانا ایک طرف اور تلاوت قرآن ایک طرف (۲) سُر تال (۳) سورۂ زمر:۲۳ (۴) ہمارے رونگٹے جو کھڑے نہیں ہوتے۔

بدولت اور جب کبھی کوئی صحیح پڑھنے والا آجاتا ہے تو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ قلوب کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پڑھنے میں جو ہم کو مزا نہیں آتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو پڑھنا نہیں آتا لہذا اس کی کوشش کرنی چاہئیے کہ ہم کو پڑھنا آئے۔ یہ حصہ لفظی علم کا تو بحمداللہ ختم ہوگیا اب علمِ معانی کا درجہ اور عمل باقی رہ گیا آج اس میں جو رہ گیا تھا قابلِ بیان ہے۔

علمِ دین سیکھنے کی ضرورت

یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے التفاتی علومِ دینیہ سے ہو رہی ہے اب دیکھئے کہ یہ مضر ہے یا نہیں، میں فضائل بیان نہیں کرتا کیونکہ ضرورت کے بتلا دینے کے بعد فضائل کے ذکر کی حاجت نہیں تو میں صرف اتنا بیان کروں گا کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس گورنمنٹ کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے اور قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلبِ منفعت اور دفع مضرت ہے(۱) لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ(۲) ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص تجارت کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ دریافت کرے کہ کس کس چیز کی تجارت کی اجازت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کوکین (۳) کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رُکے اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں، اگر ہم اس

(۱) فائدے کا حصول اور نقصان سے بچاؤ ہے (۲) نقصان ہے (۳) ایک نشہ آور اور بے حس کر دینے والی دوا۔

کی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحبِ قوانین نہ ہوتا تب تو چنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدوں قوانین سیکھے چارہ نہیں خدا تعالیٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط(۱) ہے ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکماء بھی اس کو جانتے ہیں۔ رہا دوسرا جُز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں۔

قوانینِ قرآن

اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا اُن کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے کہیں ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾(۲) ''اللہ نے خرید وفروخت حلال کی ہے اور سود حرام کیا ہے'' ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا﴾(۳) ''دور رہو زنا سے'' غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہماری معاشرت اور ہمارے معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدمِ اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے پھر کیا شبہہ رہ گیا۔

عوام کی غلط فہمی

آج کل لوگ قوانینِ خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزے ہی میں کونسا اہتمام کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی۔ مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے اس کو بھی یہاں

---

(۱) اللہ کی قدرت نے سب چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے (۲) سورۂ بقرہ: ۲۷۵ (۳) سورۂ بنی اسرائیل: ۳۲۔

تک ترقی ہوئی کہ تحریرًا اور تقریرًا یہ کہا جاتا ہے کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیبِ نفس اب بوجہ غلبۂ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی اس لئے نماز کی ضرورت نہیں۔ روزہ کے متعلق کہتے ہیں کہ فدیہ دیدیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔

ہر شخص کو قرآن کے معنٰی بیان کرنے کی اجازت نہیں

اور یہ خرابی اس کی ہے کہ ہر شخص قانونِ شریعت کے معنٰی بیان کرنے میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہدے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائی کورٹ میں جاکر منسوخ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنٰی نہیں سمجھے اب دیکھئے کہ ماتحت بھی جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے مگر چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہائی کورٹ کے جج کے برابر کوئی قانون کو نہیں سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہو اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بعض لوگ اس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے۔ اب میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ قرآن شریف کے سمجھنے والے ایک ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وحنیفہؒ تھے۔ ایک آج کل کے زید وعمر ہیں تو اپنے اور ان کے علوم کا مقابلہ کرکے دیکھ لیں بلکہ ان حضرات کے متبعین ہی کے علوم سے مقابلہ کرلیں جو کہ اپنے کو ان سے بدر جہا کمتر سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان ہی کے علوم سے زمین وآسمان کا فرق ظاہر ہوگا اور ابوحنیفہؒ کے علم سے تو کیا جانے کتنا فرق ہوگا تو دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج اور ماتحت جج باوجودیکہ دونوں یکساں ہیں مگر پھر بھی فرق مانا گیا تو دین میں اس کا قائل کیوں نہ ہوا جائے گا خودرائی کی اجازت کیونکر دی جائیگی۔

سلف صالحین کے مقابلے میں آج کل کے اسکالرز کی تفسیر کا حال

ان سلف صالحین کے مقابلہ میں اگر ہم تفسیر کرنے بیٹھیں تو وہ تفسیر ایسی ہوگی جیسے کہ ایک غیر ملک دیہاتی کے پاس ایک من کا بورا تھا جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو پلیٹ فارم پر جانے کے وقت ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ اس کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ ہمارے پاس یہ ٹکٹ ہے یہ ہی کافی ہے ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے ہم اس اسباب (۱) کا ٹکٹ مانگتے ہیں کیونکہ یہ پندرہ سیر سے زائد ہے۔ اب یہ دیہاتی صاحب قانونِ ریلوے کی تفسیر کرتے ہیں کہ پندرہ سیر کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس لئے کہ ہندوستانی لوگ اس سے زائد اسباب اپنے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے اور ہم چونکہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ حد ہمارے واسطے نہیں بلکہ جس قدر ہم اٹھا سکیں اس قدر کی ہم کو اجازت ہے۔ آپ اس تفسیر کو سن کر اندازہ کیجئے کیا یہ تفسیر ٹکٹ کلکٹر کے مقابلے میں صحیح مانی جائے گی اور کیا ٹکٹ کلکٹر کے ذمہ یہ واجب ہے یا اس کو جائز ہے کہ اس کو اس تفسیر کی اجازت دے، نیز کیا اس کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مناظرہ کرے یا صرف یہ کافی ہے کہ اس کو ڈانٹ دے اور اس سے محصول وصول کرے، اور کیا اس کا یہ کہنا منشا قانون کا یہ ہے کہ ہندوستانی پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے قابل سماعت (۲) ہے، اور کیا ٹکٹ کلکٹر پر یہ ضروری ہے کہ اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے سن کر نہایت اطمینان سے اس کو سمجھا دے کہ نہیں بھائی تم غلط سمجھے قانون کا یہ منشا (۴) نہیں، اور اگر وہ غصہ ہو تو کیا وہ قابلِ ملامت ہے۔

---

(۱) سامان (۲) قابل توجہ (۳) قانون کا یہ مطلب نہیں۔

سلف صالحین اور آج کل کے اسکالرز برابر نہیں ہوسکتے

جیسے آجکل علماء پر الزام دھرا جاتا ہے کہ ان کو بہت جلد غصہ آجاتا ہے ہر گز نہیں۔ بات یہ ہے کہ صاحب فن غیر فن داں سے کلام کرنے کو اپنے لئے عار اور تضیع اوقات (۱) سمجھتا ہے اور بزبانِ حال وہ کہتا ہے کہ ؎

تو ندیدی گہے سلیماں را　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

''لو تم نے حضرت سلیمان علیہ السلام تک کو نہیں دیکھا تم چڑیوں کی زبان کیا جانو گے''

بلکہ غیر فن والوں پر واجب ہے کہ بجائے مناظرے کے وہ یہی کہدے کہ ؎

من نہ دیدم گہے سلیماں را　　چہ شناسم زباں مرغاں را

''میں نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا میں چڑیوں کی زبان کیا جانوں''

باقی سوالات کا پیدا ہونا وہاں بھی ہے جس نے کبھی قوانین نہ سنے ہوں اس کو بھی یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ پندرہ سیر کی اجازت کیوں ہوئی چودہ سیر یا سولہ سیر کی اجازت کیوں نہ ہوئی' تو اگر اس دیہاتی کی رائے مقبول ہے تو آج کل کے عقلاء کی رائے بھی مقبول ہے۔

صاحبو! کیا فن داں اور غیر فن داں برابر ہوسکتے ہیں؟ کبھی نہیں: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲) ''کیا جاننے اور نہ جاننے والے برابر ہوسکتے ہیں''، معلّمین خوب جانتے ہیں کہ ان کو اپنے طالب علموں کی کم فہمی پر اکثر غصہ آتا کہ کم بخت سمجھتا ہی نہیں' تو کیا ان لوگوں کو طالب علموں سے عداوت ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں' بلکہ یہ طبعی قاعدہ ہے غرض دیکھئے کہ باوجود اس بات کے اس دیہاتی کی تفسیر ناواقف کے دل کو لگتی ہے مگر جس نے ریلوے کا یہ قاعدہ بچپن سے سنا ہے اس لئے اس کی تفسیر پر ہنسی آتی ہے۔ کاش اگر اہلِ علم کو قابلِ

(۱) باعث شرمندگی اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے (۲) سورۂ زمر: ۹۔

اعتماد سمجھتے تو ان کے مقابلے میں کوئی مخترع تفسیر (۱) آپ کے دل کو نہ لگتی۔ صاحبو! کیا تیرہ ۱۳۰۰ سو برس کے بعد آج قرآن شریف کے معنی حل ہوئے ہیں۔

مفسرین کی تفسیر کے خلاف کسی جدید محقق کی رائے کا اعتبار نہیں

دوسرے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے قاعدے کے موافق کثرت رائے سے ہر بات طے ہوتی ہے اور اگر کسی بات پر اتفاق رائے ہوجائے تو بہت ہی قوت کے ساتھ وہ بات طے ہوجاتی ہے۔ سو مسائل شرعیہ تو تیرہ سو برس سے آج تک مسلّمہ متّفقّہ چلے آتے ہیں اور اگر یہ بات بھی نہ ہو تو کثرت کے بعد غیر ممبروں کی رائے کوئی قابل وقعت نہیں شمار ہوتی بس اسی طرح دین میں بھی کثرت رائے کے بعد چند ناواقفین کا اختلاف کرنا کوئی چیز نہ سمجھا جائے گا افسوس سے کہا جاتا ہے کہ روزے کے بارے میں اس قدر گڑبڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں اور آیت کی تفسیر بالکل اپنی رائے سے خلافِ مقصود کی ہے حالانکہ اس کی حقیقت کو اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو کچھ شوق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے سے زیادہ سمجھنا چاہا کرتے ہیں اگر ان کو اصلی جواب دیا جائے تو سمجھتے نہیں اور اگر دوسرا جواب دیا جائے تو زبردستی پر محمول کرتے ہیں۔

قرآن پاک کی تفسیر سمجھنے کے لئے اصول سے واقف ہونا ضروری ہے

روزے ہی کو لیجئے کہ ﴿ یُطِیْقُوْنَ ﴾ کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار کردیا حالانکہ یہ آیت معنی اثبات پر منسوخ ہے اور عدمِ نسخ کی تقدیر پر معنی نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہہ پر عربیت کے جاننے کی ضرورت ہے اور جس کا ذہن دونوں سے خالی ہو وہ تو اس کو بات بنانا ہی

(۱) اپنی طرف سے گھڑی ہوئی تفسیر۔

سمجھے گا اور اگر نفس فن سے مناسبت ہو تو تھوڑے اشارے سے اس کو شفا(۱) ہو جاتی ہے۔ ایک منطقی صاحب کو شبہ ہو گیا کہ قرآن شریف سے مسئلہ غلامی کا ابطال ثابت ہوتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے ﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾(۲) ’’یا تو یونہی احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر‘‘ اور یہ صیغہ حصر کا ہے پس غیر مَنّ اور غیر فداء منفی ہوگا(۳) ایک عالم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ یہ قضیہ کونسا ہے کہنے لگے منفصلہ پھر انہوں نے پوچھا کہ حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو (۴) اس کو سن کر ان منطقی مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور شبہ زائل ہوا اور بے انتہا خوش ہوئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ حقیقیہ ہے انہوں نے تنبہ کر دیا کہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو تو وہ تو چونکہ ذی علم تھے اس لئے ایک اشارہ کر دینے سے ان کو حل ہو گیا لیکن جس شخص کو معلوم ہی نہ ہو کہ حقیقیہ مانعۃ الخلو یا مانعۃ الجمع کس کو کہتے ہیں وہ تو اس کو گھیر گھار کا جواب ہی سمجھے گا اگر ایک شخص سے کہا جائے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں اور فن اقلیدس سے واقف نہ ہو تو کسی طرح بھی آپ اُس کو نہ سمجھا سکیں گے اگرچہ ہزار دفعہ ناپ کر دکھا دیجئے جیسے ہمارے ہاں ایک شاعر تھے کہ وہ اپنے اشعار کے مصرعے دھاگے سے ناپ کر برابر کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ آپ کا ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہے کہنے لگے کہ یہ تو اوپر سے ہوتی آئی ہے۔ ’’الٰہی غنچۂ امید بکشا‘‘ اس کو تو کھینچ کھینچ کر پڑھا۔ ’’گلے از روضۂ جاوید بنما‘‘ اس کو جلدی سے پڑھ دیا۔ دیکھو اس میں بھی مصرعۂ ثانی چھوٹا ہے‘ اب جو لوگ فن شعر سے واقف ہیں وہ اس کو سن کر داد دیں گے اور سمجھیں گے کہ اس شخص کو کسی طرح بھی نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مصرعے برابر ہیں۔

(۱) اس کی تسلی ہو جاتی ہے (۲) سورۂ محمد: ۴ (۳) جب اس آیت سے احساناً بغیر کسی بدلے کے اور فدیہ لیکر چھوڑنے کی خصوصیت معلوم ہوئی تو بغیر احسان اور بغیر فدیہ چھوڑنا منع ہوگا (۴) یہ منطقی اصطلاحات ہیں جن کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں عوام کسی عالم سے سمجھ لیں۔

آج کل کے عقلاء کے دلائل کی حقیقت

واللہ اے صاحبو! علماء کے نزدیک آج کل کی دلیلیں اس سے بھی بدتر ہیں جیسے یہ شاعر سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑی دلیل قائم کردی ہے۔ ایسے ہے آجکل کے عقلاء اپنے دلائل کو نہایت مدلل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ علماء کے نزدیک: ﴿اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ﴾ [1] ''مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ہوتے ہیں'' علماء فضلاء اُن پر ہنستے ہیں اور ان بیچاروں کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں اور جس طرح وزن اور تقطیع نہ جاننے کی وجہ سے اس شاعر کو نہیں سمجھا سکتے تھے اسی طرح مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو نہ جاننے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے مگر جاننے والوں سے پوچھئے کہ یہ ایک چھوٹا سا لفظ سن کر ان کی کیا حالت ہوئی کہ وجد آنے لگا۔ اسی طرح اس یُطِیْقُوْنَهٗ کے دو جواب ہیں ایک موقوف ہے عربیت جاننے پر دوسرا اصول جاننے پر' مگر ناواقف لوگ دونوں کو زبردستی کا جواب کہتے ہیں اچھا صاحب زبردستی ہی کا جواب سہی لیکن جیسے اُس دیہاتی کا علاج حکومت سے ہوگیا ایسے اگر آج یہ بات حاصل ہو تو ہم بھی بتلادیں کہ ایسے لوگوں کے لئے اصلی جواب کیا ہے۔ باقی اس کے سوا تو اگر دفتر کھول کر بھی سامنے رکھدیجئے تو تسلی نہیں ہوسکتی اس وقت علماء سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسا جواب دیں جس سے تسلی ہوجائے۔

صاحبو! وہ اسباب بھی تو پیدا کرو جو موجب تسلی ہیں یعنی علوم حاصل کرو۔

تہذیب کی حقیقت

علی ہذا آج ایک یہ مرض بھی عام ہورہا ہے کہ احکام میں علتیں نکالی جاتی ہیں چنانچہ روزے میں یہ علت نکالی گئی ہے کہ چونکہ ابتداء میں بہیمیت [2] کا غلبہ

(۱) سورۃ العنکبوت: ۴۱ (۲) قوت حیوانیہ۔

تھا اس لئے روزہ اس کی کسر(۱) کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب چونکہ ہم مہذب ہو چکے ہیں اس لئے ہم کو ضرورت نہیں افسوس ہے کہ ہم لوگ تہذیب ہی کو نہیں سمجھتے۔

صاحبو! تہذیب یہ ہے کہ تمام رزائل نفس کے دور ہو جائیں نہ یہ کہ مزاج میں قدرے نظافت یا تکلف آ جائے ہم لوگوں میں ہرگز تہذیب نفس نہیں ہے ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں تواضع، تحمل، بردباری، ایثار کا نام تک نہیں بلکہ خودغرضی، غضب، چھچھوراپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ایثار کی کمی

میں ایک زندہ مثال دیتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ڈپٹی کلکٹر کی درخواست دے رکھی ہو اور یہ شخص خوش حال فارغ البال ہو اور اسی دوران میں ایک دوسرا شخص بھی اس عہدے کی درخواست دے جو کہ نمبر درخواست میں اس کے بعد ہو لیکن یہ دوسرا شخص مفلوک الحال (۲) غریب مقروض ہو تو ایسی صورت میں ہم نے کبھی سُنا بھی نہیں اس پہلے فارغ البال نے اس کی فِلاکت (۳) پر ترس کھا کر اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور اس کو اپنے سے مقدم کر دیا ہو علی ہذا ہر معاملہ میں تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ہم میں ایثار کی صفت نہیں بلکہ خودغرضی ہے۔

تہذیبِ اخلاق کا منشاء

اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اخلاق درست ہیں تو یہ دیکھو کہ اس کا منشاء کیا ہے سو تہذیب اخلاق کے دو منشا ہوتے ہیں کبھی تو مصلحت تمدن کے لئے اپنے اخلاق کو گونہ مہذب کیا جاتا ہے اور کبھی ضرورت دینیہ کے لئے جیسے ایک تاجر اس

---

(۱) اس کو توڑنے کے لئے روزہ فرض کیا گیا (۲) غریب اور ضرورت مند ہو (۳) اس بے فکر آدمی نے اس کی غربت پر ترس کھا کر اپنی درخواست واپس لی ہو۔

لئے سچ بولتا ہے کہ اس میں دکان کی بات بنی رہے گی اور لوگ اعتبار کریں گے۔ اور دوسرا اس لئے بولتا ہے کہ خدا خوش ہو تو سمجھئے کہ دنیاوی اور تمدنی مصالح چونکہ ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں اگر اس کو کبھی معلوم ہو کہ اب جھوٹ بولنے میں یہ مصلحت حاصل ہوگی تو وہ فوراً جھوٹ بولے گا اور دین کے مصالح چونکہ متبدل نہیں ہوتے اسلئے اس میں یہ احتمال نہیں ہے اس کا کتنا ہی نقصان ہو تب بھی یہ جھوٹ بولنا گوارا نہ کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ مرضیٔ خدا کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تہذیب اخلاق خدا کے خوف سے ہو تو وہ مستحکم ہے ورنہ نہیں، تو اول تو تہذیب کے وجود ہی میں کلام ہے اور اگر وجود مان بھی لیا جائے تو اس کی پائیداری میں کلام ہوگا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہوگا تو اگر تہذیبِ نفس ہی نماز روزے کی علّت ہوتی تب بھی ہم کو چھوڑنا ناجائز تھا کیونکہ ہم کو تہذیب بھی حاصل نہیں۔

علّت اور حِکمت میں فرق

اور بالخصوص جبکہ نماز روزے سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہے کہ اس کے حکم پر سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اگر کہو کہ بعض نصوص کے اشارات (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں شہوت کا انکسار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت ہے اور میں اس کے حکمت ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ امور علت نہیں ہیں جن پر نفیاً اور اثباتاً مدار (۲) حکم ہو، حکمت وہ ہے کہ حکم پر مرتب ہو اور علت وہ ہے کہ اس پر حکم مرتب ہو۔ تو نماز روزے کا وجوب اس کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ وجوب محض خدا کے حکم سے ہوا اس پر یہ حکمتیں مرتب ہوئیں اور اگر کوئی امر علت بھی ہو تو جب موجِب (۳) نے خود اس کو

(۱) بعض احادیث سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے (۲) یہ علت نہیں ہے جس پر روزہ رکھنے نہ رکھنے کے حکم کا مدار ہو (۳) اس حکم کو واجب کرنے والی ذات یعنی اللہ تعالیٰ۔

متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے۔

احکامِ الٰہی کی علتیں پوچھنا

کسی بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور ﷺ کیا باتیں ہوئی تھیں انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ؎

بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان

''اب کسے ایسا دماغ ہے جو مالی سے پوچھے بلبل نے کیا کہا کہ پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا''

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم پوچھیں کہ اس حکم کی کیا علت ہے اور اس کی کیا حکمت ہے، بانیانِ قوانین سے عام رعایا کو ہرگز یہ مجال نہیں کہ کسی ایک قانون کی وجہ بھی دریافت کرلیں تو خدا تعالیٰ سے باز پرس کرنے کی کیونکر اجازت ہوگی۔ البتہ اگر کوئی مشیر قانون ہو تو اس کو ایسی اجازت ہے تو اگر ہم کو کوئی سرٹیفکیٹ خدا تعالیٰ کے ہاں سے مل گیا ہو تو پیش کریں کتنی غضب کی بات ہے کہ یہ معترض ایک سلطنت دنیوی کا ممبر تو نہ بن سکے اور خدا کی حکومت میں دخیل ہوجائے۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کو تو پارلیمنٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پس ہمارا تو مذہب یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

زبان تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علّت از کارِ تو

''آپ کا ذکر کرنا چاہیئے نہ آپ کے کاموں کی علّت''

اللہ تعالیٰ کی محبت کا مقتضٰی

دیکھئے خدا تعالیٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں۔ حاکم ہونے کا بھی محبوب

ہونے کا بھی۔ فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو ان کو نہات خوشی سے پورا کرو گے یا نہیں، تو اگر خدا تعالیٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں ورنہ یہ حالت ہونی چاہئیے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو   در بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو   ہرچہ کنی رضائے تو

"اگر مجھے زندہ کیجئے تو آپ کی عطا ہے اگر مجھے مار ڈالئے تو میں آپ پر قربان ہوں بہرحال روح کو آپ سے تعلق ہے جو چاہیں کر سکتے ہیں"

آج کل لوگوں کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کچھ بھی محبت ان کو نہیں ہے اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا جتنا ایک بازاری عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود   گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

"خدا کا عشق لیلیٰ کے تعلق سے کم کیسے ہوسکتا ہے، اس کے عشق میں سراپا ذلت بن جانا بہتر ہے"

بہرحال محبت کی رو سے دیکھئے یا حکومت کی رو سے دیکھئے ہر طرح سرِ تسلیم خم کر دینا واجب ہے۔

لوگوں کے شبہات کے جوابات

بعض لوگوں کو تو اس طرح ترقی ہوئی اور بعض لوگ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوئے۔ یعنی وہ نماز روزے میں شبہات نکالتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ روزہ ہے تو اچھی چیز لیکن فروری کے مہینے میں ہونا چاہیئے تھا گویا آپ نے خدا

تعالیٰ کو یہ رائے دی۔ افسوس اول تو ہم کو رائے دینے کا حق کیا ہے دوسرے رائے بھی مہمل کیونکہ فروری میں سردی تمہارے ملک میں ہوتی ہے نہ کہ سارے عالم میں خدا تعالیٰ کی کیا عجیب حکمت ہے کہ سارے عالم کو مساوی(۱) حالت میں رکھا کہ ایک سال ہندوستان میں سردی میں ہے تو دوسرے ممالک میں گرمی میں ہے اور اگر دوسرے ممالک میں سردی میں ہے تو ہندوستان میں گرمی میں ہے تو اس میں سب کا اوسط برابر ہوگیا جو عین عدل ہے۔

احکامِ شریعت میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ

بعض لوگوں نے ایک اور شبہہ نکالا ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز روزہ کیسے کریں گے' یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ احکامِ خداوندی کی عظمت نہیں۔ دیکھئے قوانین حکومت میں کبھی آپ کو یہ شبہہ نہ ہوا کہ ڈاکخانہ ےا(۲) کا ٹکٹ لفافے پر لگادو تو خط بیرنگ نہ ہوگا اور اگر عہ/(۳) کا ٹکٹ لفافے پر لگادو تو خط بیرنگ ہوجائے گا۔ جو لوگ اس کا راز جانتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے جو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی کبھی شبہہ نہیں ہوتا اور اگر شبہہ کریں تو احمق بنائے جائیں اور سب اُن کو ہنسیں اور یہ ہی جواب دیں کہ قانون یہی ہے۔ جب یہی جواب ہے تو اگر کوئی مولوی بھی آپ کے لغو سوالات کا یہی جواب دے کہ قانون یہی ہے تو وہ جواب زبردستی پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور اس کو قابل سماعت

---

(۱) برابر حالت میں رکھا کہ رمضان میں روزے فرض کئے فروری میں نہیں اس لئے کہ رمضان کبھی گرمی میں آتا ہے کبھی سردی میں اور بعض علاقوں میں گرمی میں بعض میں سردی میں تو سب کی رعایت ہوئی (۲) دو پیسے کا ٹکٹ توجہ: ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے ہیں اور ایک آنے میں چار پیسے ہوتے ہیں گنتی لکھتے وقت ایک آنے لکھنے کا یہ طریقہ تھا جس طرح حضرت نے لکھا ہے اور ایک روپیہ لکھنے کا وہ طریقہ ہے جو اگلی سطر میں لکھا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر لفافے پر بجائے ایک پیسہ کے ایک روپیہ کا ٹکٹ لگایا جائے تو خط بیرنگ ہوگا ایک سے سو تک گنتی لکھنے کا طریقہ بہشتی زیور حصہ دہم ص ۳۶ پر دیکھئے (۳) ایک روپے کا ٹکٹ۔

کیوں نہیں سمجھا جاتا اور علماء کو کیوں متعصب کہا جاتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ شریعت کی عظمت دل میں نہیں اور قانونِ حکومت کی عظمت دل میں ہے اور جب قانونِ شریعت کی عظمت نہیں تو پھر کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ تو ایسے شبہات اسی وقت دل میں آتے ہیں جب عظمت نہ ہو۔

جہاں چھ ماہ کا دن چھ ماہ کی رات ہو وہاں نماز کس طرح پڑھیں گے؟

ایسا ہی یہ شبہہ بھی ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہو تو وہاں کیونکر نماز پڑھیں اور کیسے روزہ رکھیں؟ مجھے اس پر ایک واقعہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ کا یاد آیا۔ ایک مرتبہ وہ ریل میں انٹر میں سفر کر رہے تھے اور برابر کے درجہ میں چند نوجوان آ کر بیٹھے جو وضع سے انگریزی طالب علم معلوم ہوتے تھے ان کے قبل سے ایک معمر شخص سوار تھے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور کسی ضرورت سے اس وقت اُتر گئے تھے ان نوجوانوں نے ان بیچارے کا اسباب منتشر کر کے اپنا سامان رکھ دیا وہ مولوی صاحب جو آئے اور معلوم ہوا تو ان پر بہت ملامت کی کہ آپ لوگوں کو اس تحکم (۱) کا کیا حق تھا' غرض یہ سب شرمندہ ہوئے اور براہِ شرارت یہ چاہا کہ ان مولوی صاحب کو بھی کسی بات میں شرمندہ کریں۔ اتنے میں مولوی صاحب نماز پڑھنے لگے تو ان کو ایک بات ہاتھ آئی بعد فراغ ان میں سے بعض نے ان مولوی صاحب سے کہا کہ کیا ہم آپ سے کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ آجکل کی تہذیب میں یہ بھی لازم ہے کہ اگر کچھ پوچھے تو اول اجازت لے۔ چنانچہ ان مولوی صاحب نے اجازت دی اس پر ان لڑکوں نے یہ سوال کیا کہ مولوی صاحب نماز فرض ہے؟ مولوی صاحب نے کہا ہاں' کہنے لگے کتنے وقت کی فرض ہے؟ مولوی صاحب نے کہا پانچ وقت کی' کہنے لگے سب پر پانچ وقت کی فرض ہے؟

(۱) اس زبردستی کا۔

مولوی صاحب نے کہا ہاں ہر مکلّف پر پانچ وقت کی فرض ہے، کہنے لگے سب جگہ فرض ہے؟ مولوی صاحب نے کہا ہاں، اس پر کہنے لگے کہ کیوں؟ جس مقام پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی نماز پانچ ہی وقت فرض ہے اگر یہ ہے تو سال بھر میں پانچ ہی نماز فرض ہوئیں۔ مولوی صاحب نے ایک نہایت دانائی کا جواب دیا کہ تم لوگ وہاں سے آ رہے ہو یا وہاں جانے کا قصد ہے؟ کہنے لگے کہ صاحب نہ آ رہے ہیں نہ جانے کا قصد ہے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب دونوں باتیں نہیں تو یہ سوال قبل از وقت ہے جب اس کی ضرورت پڑے گی اس وقت پوچھنا۔ لیکن ان شریروں نے اس جواب کی قدر نہ کی بلکہ سب ہنس پڑے۔ اور ان مولوی صاحب کو شرمندہ کرنا چاہا، اتفاق سے ان میں ایک شخص پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے جو وضع سے کوئی معزز اہلکار معلوم ہوتے تھے وہ بھی ہنسنے میں شریک تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب کو ان صاحب پر نہایت غصہ آیا کہ یہ تو لڑکے بھی نہیں ان کو کیا شامت سوار ہوئی۔ غرض کوئی اسٹیشن آیا مولوی صاحب اپنے درجے سے ان کے درجے میں پہنچے مگر وہ لڑکے تو اتر گئے اور وہ صاحب موجود رہے۔ انہوں نے نماز کے لئے وضو کیا تب تو مولوی صاحب کو زیادہ غصہ آیا کہ ماشاء اللہ نمازی ہو کر ان کی یہ حالت ہے مولوی صاحب نے ان سے عہدہ اور فرائض عہدہ دریافت کر کے پوچھا کہ آپ کے ذمہ دن رات میں کتنے گھنٹے کام کرنا ہے۔ انہوں نے مثلاً چھ گھنٹے بتلایا مولانا نے کہا کہ اگر ایسے مقام پر جہاں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے گورنمنٹ کی حکومت ہو جائے اور آپ کی وہاں بدلی ہو جائے تو کیا وہاں بھی رات دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوگا تو سال بھر میں چھ گھنٹے کام کرنا پڑا اس کا حساب کس طرح ہوگا۔ کہنے لگے اندازہ کر لیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ افسوس دنیوی حکومت کے قانون پر جو اشکال وارد ہو اس کی

توجیہہ تو اس طرح آسانی سے ہوسکتی ہے اور یہی توجیہہ اس اشکال میں نہ ہوسکی بلکہ اس پر تمسخر کرتے ہوئے شرم نہیں آتی بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ کی۔ غرض اس قسم کے شبہات ہونے لگے ہیں۔

شبِ قدر کی فضیلت پر شبہے کا جواب

ایک صاحب کہنے لگے کہ شبِ قدر میں فضیلت ہے تو کہاں کی شب قدر میں ہندوستان کی یا لندن کی؟ کیونکہ غروب ہر جگہ کا مختلف ہے مولانا احمد حسن صاحب نے خوب جواب فرمایا کہ بعض مواسم میں کچہری دس بجے ہوتی ہے تو کہاں کے دس بجے مراد ہوتے ہیں ہندوستان کے یا لندن کے جو جواب اس کا ہے وہی اُس کا ہے کہ ہر جگہ کی شب قدر میں فضیلت ہے خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے جب یہاں غروب ہو یہاں کے لئے، جب وہاں غروب ہو وہاں کے لئے، یہ دو چار مثالیں نمونے کے طور پر بیان کردی ہیں۔

شبہات کی وجہ

اس قسم کے لغو شبہات بہت سے ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ احکام شریعت کی عظمت دلوں میں نہیں رہی اور دوسرے یہ کہ ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ انسان جس چیز کو ضروری سمجھا کرتا ہے اس میں شبہات نہیں نکالا کرتا مثلاً اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جاوے اور وہ نسخہ لکھ کردے اور مرض سخت ہو تو اعتماد کے بعد یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے فلاں دوا کیوں لکھی یا فلاں دوا کا یہ وزن کیوں لکھا اس کا دونا یا نصف (۱) کیوں نہیں لکھا کیونکہ جانتا ہے کہ اگر ذرا بھی بے ڈھنگا پن کیا تو حکیم صاحب خفا ہوکر مطب سے نکال دیں گے اور نسخہ بھی نہ دیں

(۱) اس کا دوگنا یا آدھا کیوں نہیں لکھا۔

گے نتیجہ یہ ہوگا کہ میں مروں گا۔ اگر شریعت کو بھی ضروری سمجھتے تو احکام کے بتلانے والوں کا وجود غنیمت سمجھتے جیسے طبیب کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر نسخہ پینا ہی نہ ہو تو اس میں جتنے چاہیں عیب نکال دیتے ہیں۔ صاحبو! واللہ اگر دین کی طلب ہوتی تو غنیمت سمجھتے کہ احکام کے معلوم ہونے کے ذرائع موجود ہیں مگر چونکہ کام کرنا نہیں ہے اس لئے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور انواع انواع کے بے ڈھنگے سوالات کئے جاتے ہیں۔

ایک دن میں پانچ نمازیں کیوں فرض ہیں؟ اس شبہے کا جواب

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی؟ میں نے کہا کہ تمہاری ناک منہ پر کیوں لگی ہے گدّی پر کیوں نہ لگی کہنے لگے کہ گدّی پر اگر لگتی تو بُری لگتی، میں نے کہا کہ بُری تو جب لگتی کہ صرف تمہاری ناک گدّی پر ہوتی اور اگر سب کی گدّی پر ہوتی تو ہرگز بری نہ لگتی تو کیا وجہ کہ سب کی ناک گدّی پر کیوں نہیں لگی، میں کہتا ہوں کہ اول اپنی خبر لیجئے اس کے بعد نماز وغیرہ تک نوبت آئے گی۔ بہت بہتر ہے کہ انسان اپنی دنیا کی تحقیقات میں لگے دین کی تحقیق ہو چکی ہے اس پر عمل کافی ہے دوسرے جب تیرہ سو برس کی تحقیق آپ کے نزدیک غلط ثابت ہوئی تو تیرہ منٹ کی تحقیق کیوں کر صحیح یقینی ہے۔

حضراتِ صحابہؓ کی عقل وفراست کی دلیل

صاحبو! سلامتی کی بات یہ ہی ہے کہ جس شاہراہ پر چل کر سینکڑوں پار ہو گئے اس کو چھوڑ کر ایک غیر مجرّب پگڈنڈی کو اختیار نہ کرو نیز کیا آپ سے قبل کوئی عاقل اور ہمدردانِ اسلام ہوا ہی نہیں۔ کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کو دین کا کچھ درد

ہی نہ تھا اور کیا ان کو آپ کے برابر بھی عقل نہیں تھی اور اگر عقل نہ تھی تو کیا وجہ کہ ھرقل اور کسریٰ تک پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے مصاحبین کی گفتگو کا اثر ہوتا تھا۔ ان کی عقلوں کا اندازہ اس سے کرو کہ ان کے پاس نہ نقشے تھے نہ جغرافیہ اور جب مصر دمشق قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو ان مقامات پر کس طرح قبلہ رُخ نہایت ٹھیک سمت میں مسجدیں بنائیں کہ آج تک آلاتِ ہندسہ سے سب برابر ثابت ہوئیں اور یہ ایک چھوٹی سی بات ہے اس سے بڑی بڑی ہزاروں باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ عاقل تھے اور بہت بڑے مدبّر تھے دیکھئے ملکی انتظام کس طرح کا کیا پھر ان کو وہ شبہات کیوں نہ پیدا ہوئے وہ اتنے مہذب تھے انہوں نے کیوں نمازیں نہ چھوڑیں کیوں روزہ میں ترمیم نہ کی۔

سلامتی کی راہ

معلوم ہوا کہ اول کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا نہایت خطرناک ہے نابینا کے لئے یہ ہی مناسب ہے کہ کسی بینا کے ساتھ ہولے اور جدہر کو وہ لے چلے اُدھر کو چلے اور اگر کسی موقع پر بینا نے کہا کہ یہاں نالی ہے اور نابینا صاحب لگے دلیل پوچھنے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے گا اور یہ گر کر مریں گے۔

احکامِ دین میں ترامیم پیش کرنے کی وجوہ

پھر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ترمیمیں جو پیش کی جاتی ہے ان سے غرض کیا ہے آیا دنیا کا فائدہ یا دین کا سو ظاہر ہے کہ دین کا تو کوئی فائدہ نہیں ہاں دنیا کا فائدہ ہے کہ نماز پڑھنے سے بچیں گے پھر وہ نہ رہے گا تو آزادی نصیب ہوگی سود حلال ہوجائے گا تو مال میں ترقی ہوگی ہر مسئلہ طویل الذیل (۱) ہے۔

(۱) ہر مسئلہ میں لمبی بحث ہے۔

اپنے ایمان کی حفاظت کرو

میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر فرضاً مصلحت نکل سکتی تو صرف یہ ہی نکل سکتی ہے اور فرضاً اس لئے کہا کہ ہنوز اس میں بھی کلام ہے کہ ان کو مصلحت کہنا بھی درست ہے یا نہیں لیکن اگر مان بھی لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ مصالح تو بغیر دین میں کلام کئے بھی حاصل ہوسکتی ہیں۔ مثلاً مال میں ترقی اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ سود کو حرام سمجھا جائے اور پھر اس کا مرتکب ہوا جائے کیونکہ ترقی تو فقط سود لینے سے ہے نہ کہ سود کے حلال کہنے سے تو اگر برباد ہی ہونا ہے تو سود ہی لو سود کو حلال تو نہ کرو کہ ایمان بھی جاتا رہے اور سود لینے سے تو فقط تم گنہگار ہوگے آئندہ نسلیں تو ایمان سے خارج نہ ہوں گی۔ برخلاف اس کے کہ اگر سود کو حلال کہا تو تم بھی ایمان سے خارج ہوئے اور آئندہ نسلیں بھی۔

پردے کو راحت سمجھو

علیٰ ہذا پردے سے گھبرانا سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی توڑ دو بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہوسکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے۔ واقع میں جو کچھ خرابیاں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور

پھران میں کسی قسم کا فساد ہوسکے اور جب ذراسی بے پردگی میں اتنے فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہیں اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہی ہے تو فرض سمجھ کر بھی تو چھوڑا جاسکتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کر کے ایمان بھی برباد کرلو۔

سود کو حلال سمجھنے سے بھی ترقی نہ ہوگی

ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے' میں نے کہا کہ اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہی وہ تمہارے یا مولویوں کے کہہ دینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علماء بگڑ گئے' تو حلال کہہ کر بھی سود خوروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

قربانی پر شبہہ کا جواب

ایک صاحب نے قربانی پر اعتراض کیا کہ اس سے کیا فائدہ کہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبادیا اور وجہ اس فساد کی یہ ہے کہ اپنے خیال میں احکام کا ایک مبنیٰ تراش لیا ہے مثلاً قربانی کا مبنیٰ یہ تراش لیا ہے کہ مساکین کو نفع ہو اور چونکہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبانے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اس لئے اعتراض کیا جاتا ہے۔اس اعتراض کا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ ؎

ع سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

میں بیان کرتا ہوں کہ اگر قربانی کر کے ایک حبّہ گوشت کا بھی کسی کو نہ دو تو قربانی کا ثواب ملتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود قربانی کا نہیں کہ لوگوں کو نفع ہو ورنہ

صرف ذبح کرنے سے کیوں ثواب ملتا اب رہی یہ بات کہ پھر کیا حکمت ہے تو حکمت یہ ہے کہ بندے کو بہ حیثیت محبّ ہونے کے یہ مناسب تھا کہ اپنی جان فدا کرتا اس کا بدل خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ ایک پیارے جانور کو ذبح کرو اور دلیل تاریخی اس کی یہ ہے کہ اول ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ ہماری راہ میں بیٹے کو ذبح کرو۔ بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جانِ جاں مانگی گئی تھی اسی کو فرماتے ہیں: ﴿سُنَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ﴾ ”تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے“ تو مقصود یہ تھا کہ اپنی جان دی جائے مگر اس کا بدلہ یہ مقرر فرمادیا کہ جانور کو ذبح کردو۔

جان کا نذرانہ

اور محبت ایسی چیز ہے کہ موقع پر لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کردیں ہیں ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحبِ حال جن کو لوگ مسخرا سمجھا کرتے تھے حج کرنے کے لئے جب خانۂ کعبہ کے سامنے پہنچے تو مطوف کی زبان سے یہ نکلا کہ یہ کعبہ ہے اُس وقت اُن پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعران کی زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

”جب محبوب کے کوچہ میں جاؤ تو جان مضطر کو حاضر کردو ہوسکتا ہے دوبارہ اس تمنا کو نہ پہنچ سکو“

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جان بحق ہوگئے اور سینکڑوں اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی جان نکل گئی۔

حضرت نجم الدین کبریٰ کی حکایت ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا ’’جان بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ‘‘ آپ نے فرمایا کہ محبوب جان طلب کر رہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ ’’جاں دادم و جاں دادم وجاں دادم‘‘ اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ مَا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ﴾(۱) ’’اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ تم اپنی جان مار لو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو تھوڑے ہی لوگوں نے ایسا کیا‘‘ اور اگر سب کے سب ایسے ہی ہوتے بھی تو ایک سال میں سب کے سب ختم ہو جاتے یہ تو رحمت ہے کہ اگر خیر جانور ہی دیدو تو وہ بھی کافی ہے۔

عمدہ جانور کا انتخاب

مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ جانور عزیز ہو۔ حدیث میں ہے (سمنوا ضَحَایَاکُمْ فَاِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَایَاکُمْ) ’’تم موٹی تازہ قربانی کیا کرو صراطِ مستقیم پر یہ ہی تمہاری سواریاں ہوں گی‘‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سورۂ بقرہ ختم کی تو ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھی۔ الحاصل یہ معلوم ہو گیا کہ حکمت قربانی کی وہ نہیں ہے جو کہ اس وقت لوگوں نے تراش رکھی ہے بلکہ یہ حکمت ہے اور یہ بھی ہم نے تبرعاً بتلا دیا ورنہ اصل مسلک ہمارا یہ ہے کہ ؎

حدیث از مطرب و مے گو وُ رازِ دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

’’ساقی شراب کی بات کرو گردشِ ایام کو کچھ نہ کہو اس معمّے کو نہ کوئی کھول سکا نہ کھول سکے گا‘‘

(۱) سورۃ النساء: ۶۶۔

خدا تعالیٰ کے اسرار کا احاطہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور جب ضرورت ثابت ہوگئی تو ہم کو حکمت یا اسرار کے دیکھنے اور بتلانے کی ضرورت بھی نہیں۔

احکامِ دین میں علماء کی تقلید کرو

بہرحال دین میں اختراع نہ کرو، بلکہ علم کی تکمیل کرو یا علماء کی تقلید کرو اور بدوں ان دونوں باتوں کے ہمارا مذہب اور دین بالکل ڈانواں ڈول ہے۔ بالخصوص اس آزادی کے زمانے میں اسی ضرورت علم دین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ﴿یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ اس میں مختلف تفسیریں ہیں میرے خیال میں حکمت سے مراد علومِ اجتہادیہ (۱) اور کتاب سے مراد علومِ منصوصہ (۲) اور میں اس وقت اس کی تفصیل نہیں کرتا۔

آج کل قوت اجتہادیہ کسی میں نہیں

مگر اس وقت کے رفع اغلاط کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ اجتہاد ہر شخص کا معتبر نہیں بلکہ اس کا اجتہاد معتبر ہے جس میں سامان اجتہاد بھی ہو اور یہ طے ہوگیا ہے کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ نہیں ہے۔ اس کے لئے میں ایک مسئلہ مثال کے لئے عرض کرتا ہوں اس سے پورے طور پر سمجھ میں آجائے گا کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ بالکل نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو شخص جنگل میں ہوں اور ایک کو غسل کی ضرورت ہو اور دوسرے کو وضو کی ضرورت ہو اور پانی وہاں ہو نہیں اس لئے دونوں نے تیمّم کیا اور یہ دونوں شخص جمیع صفاتِ علمیہ وعملیہ مساوی (۳) ہوں سوائے اس تفاوتِ (۴) مذکور کے تو اگرچہ امامت دونوں کی جائز ہے لیکن گفتگو اس میں ہے

(۱) وہ احکام ہیں جو اجتہاد کے ذریعہ معلوم ہوں (۲) وہ علوم ہیں جن میں کوئی آیت یا حدیث واضح طور پر منقول ہے (۳) یہ دونوں تمام علمی اور عملی صفات میں برابر ہوں (۴) سوائے اس فرق کے اور کوئی فرق نہ ہو۔

کہ افضل کس کی امامت ہے سو ہمارے اجتہاد سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کو وضو کی ضرورت ہے اس کی امامت افضل ہے کیونکہ اس میں حدث اصغر(۱) تھا اور اس لئے نجاستِ حکمی اس میں کم تھی اور طہارت میں دونوں برابر ہوئے تو وضو والے کی طہارت اکمل ہوئی مگر فقہاء کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حکم برعکس ہے اور وجہ یہ ہے کہ تیمّم خلیفہ ہے غسل اور وضو کا اور غسل افضل ہے وضو سے تو افضل کا خلیفہ بھی افضل ہوگا تو غسل کا تیمّم افضل ہوگا وضو کے تیمّم سے۔ اب دیکھئے فقہائے متاخرین کا یہ اجتہاد ہے مگر ہم اس تک بھی نہ پہنچ سکے کیونکہ اجتہاد محض پڑھنے سے نہیں ہوتا بلکہ احادیث کے جمع کرنے اور نعمت پر عبور ہونے اور اس کے بعد تقویٰ وطہارت کے حاصل ہونے سے ایک خاص ملکہ ہوتا ہے اور جب ہم میں یہ سب باتیں نہیں تو ہم کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

ہر ایک کو مولوی بنانا مناسب نہیں

اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ مسلمانوں میں علم کیونکر عام ہو کیونکہ یہ تو بہت مشکل ہے کہ سب کے سب مولوی ہوجائیں آج کل لوگ اس سے بھی گھبراتے ہیں کہ علماء اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کے سب مولوی ہوجائیں سو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو مولوی نہیں بناتے بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم روک دیں کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں ہمت اور قناعت اور دانائی اور ورع(۲) نہ ہو ان کو مقتداء بنادینے سے بہت سی خرابیاں دین میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور ہمت سے مراد دین کی ہمت ہے نہ کہ دنیا کمانے کی ہمت۔ اور ایسے ہی طماع(۳) لوگ ہیں جنہوں نے دنیا داروں کے سامنے دستِ طمع دراز کرکے اکثر لوگوں کو علمِ دین سے متنفر کردیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علم دین کا ثمرہ یہ ہوتا ہے تو اگر ہماری اولاد

(۱) بے وضو تھا اس کو وضو کرنے کی ضرورت تھی (۲) نیکی وتقویٰ (۳) جن کی طبیعت میں لالچ ہے۔

پڑھے گی تو ان میں بھی یہ ہی باتیں پیدا ہوں گی لہذا ایسے لوگوں کو ہم ہرگز مولوی ہونے کی رائے نہ دیں گے۔ بلکہ مولوی ہونا اور خدمتِ دین اس کا کام ہے جس کی یہ حالت ہو ؎

اے دل آن بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی   بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

''اے دل شراب گلگوں سے خراب رہ اور بے مال و دولت قارون کی سینکڑوں عزت پر بھاری رہ''۔

یہ تو مال میں اس کی حالت ہو اور جاہ میں یہ حالت ہو کہ ؎

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

''لیلیٰ کے گھر جانے کے راستے میں جان پر بڑے خطرے ہیں تو اولین شرط یہ ہی ہے کہ مجنون بن جاؤں''

اور یہ حالت ہو کہ صرف ایک کا طالب ہو ؎

دلا رامے کہ داری دل درد بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

''اگر محبوب رکھتے ہو تو دل اس سے بند رکھو اور تمام دنیا سے آنکھ بند رکھو''

اور یہ حالت ہو کہ ''عاشقاں را مذہب و ملت جدا است''(۱)۔ اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ سب کے سب ایسے کہاں ہیں تو اگر سب کو مولوی بنایا جاوے تو کس قدر خرابیاں پیدا ہوں۔

نا اہل کو مولوی بنانے کا نقصان

میں نے ایک استفتاء دیکھا کہ اس میں ایک مولوی صاحب نے ساس کو حلال کر دیا تھا اور کیونکر چالاکی سے یعنی یہ لکھا کہ اس شخص کی بیوی بوجہ جہالت کلماتِ

(۱) عاشقوں کا دین و مذہب الگ ہے۔

کفر و شرک میں ہمیشہ سے مبتلا ہے اس لئے اس کا نکاح اس مسلمان سے صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح نہیں ہوا تو ساس ساس نہ ہوئی اور حرمتِ مصاہرت حنفیہ کا مذہب ہے ہم پر حجت نہیں پس بیوی کو چھوڑ کر ساس سے نکاح درست ہے خوب کہا ہے ۔

بد گُہر را علم و فن آموختن دادنِ تیغست دست راہزن

''بے اصل کو علم وفن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے''

تو اگر اس مذاق کے لوگ مقتداء بنیں گے تو کیا کچھ خرابیاں ہوں گی۔

مولویت کے لئے انتخابِ صحیح کی ضرورت

اس لئے مولویت کے لئے انتخاب صحیح ہونا چاہئے سو آپ بھی اپنے بچوں میں سے انتخاب کیجئے اور اگر کہو کہ دیہاتی یا غریب لوگ تو پڑھ رہے ہیں تو سمجھو کہ وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ آپ کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اس لئے وہ آپ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ لہذا شہر والوں کے لئے شہر والے اور گاؤں والوں کے لئے گاؤں والے مولوی ہونے چاہئیں اور غرباء کے لئے غرباء اور امراء کے لئے امراء کیونکہ غرباء کی وقعت امراء کی نظر میں نہیں دوسرے اپنے کام میں لگے ہیں اس لئے بھی امراء کو توجہ کرنا نہایت ضروری ہے یہ اپنی اولاد میں سے منتخب کریں لیکن خدا کے لئے ایسا انتخاب نہ کیجئے جیسا کہ اب تک کیا ہے کہ اولاد میں جو سب سے زیادہ بیوقوف ہوا اس کو عربی پر متوجہ کر دیا۔ بلکہ زیادہ فطین زیادہ ذکی (۱) ہو اس کو عربی کے لئے انتخاب کیجئے اور اس کے اخلاق درست کیجئے اس میں تواضع پیدا کیجئے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے سے جدا کر کے کسی صاحب دل کے پاس بھیجد یجئے۔ چندروز بھی اگر وہاں رہے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ

(۱) زیادہ عقلمند اور زیادہ ذہین۔

انسانیت آجائے گی اس کے بغیر انسانیت نہیں آتی دیکھئے انگریز اپنے بچوں کو کتنی تھوڑی عمر سے جدا کر دیتے ہیں۔

تربیت کا فائدہ

ایک بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کو کسی معلّم کے سپرد کیا۔ ایک روز دیکھا کہ معلّم صاحب گھوڑے پر سوار ہیں اور شہزادہ سائیس (۱) کے مثل پیچھے پیچھے چلا جارہا ہے بادشاہ کو یہ دیکھ کر سخت ناگواری ہوئی لیکن ضبط کر کے معلّم سے بہ آہستگی دریافت کیا، معلّم نے کہا کہ حضور چند روز میں یہ بادشاہ ہوگا مخلوق اس کی جلُو میں ہوگی اگر اس وقت پیدل نہ دوڑیگا تو اس وقت کیسے خبر ہوگی کہ پیدل دوڑنے والوں پر کیا گذر رہی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو دوڑایا کہ یہ اپنی حالت یاد کر کے دوسروں پر رحم کرے۔ تو یہ برتاؤ باپ نہیں کر سکتا اور استاذ کر سکتا ہے۔

استاذ کے لئے مربی ہونا ضروری ہے

مگر ایسے استاذ نہیں جیسے آجکل کے استاذ ہیں ظالم اور قصائی جن میں شفقت نام کو نہیں، میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ چار برس سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوگی اور لڑکے اس کو ڈنڈا ڈولی کئے لا رہے ہیں۔

ع پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے (۲)

افسوس ہے کہ اکثر بچے انہی ذابِحین (۳) کے قبضے میں آتے ہیں اور وہ تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ ان کے برتاؤ سے تو طبیعت کُند ہو جاتی ہے یا پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ حافظ جی ''ہڈی ہماری چمڑہ تمہارا''۔ صاحبو! استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مربی ہو۔ اور اگر ایسا نہ کر سکے تو وہ استاذ بننے کے قابل نہیں۔

(۱) گھوڑے کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا (۲) ہاتھ بھی دوسرے کے قبضے میں اور پاؤں بھی دوسرے کے قبضے میں (۳) ذبح کرنے والوں۔

تو ایک طرف تربیت ہو ایک طرف تعلیم، پھر دیکھئے کہ یہ شخص کس شان کا نکلتا ہے۔

علماء کی معاش کا انتظام

البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لڑکوں کو علوم دینیہ پڑھایا جائے تو یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ تو اول تو امراء کو یہ سوال ہی کرنا نہ چاہیئے اور غرباء کے لئے ساری قوم کو ادھر متوجہ ہو کر اس کے لئے سرمایہ جمع کرنا چاہیئے کہ ان کی خدمت کریں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر بچپن سے امارت میں گذرے تو ان کو روز اول ہی سے استغناء کی عادت ہو جائے بڑے ہو کر حرص وغیرہ نہیں پیدا ہوتی اور اگر اول ہی سے سوال اور ذلت کا خوگر ہو جیسا آج کل قوم کی بے توجہی سے ہو رہا ہے تو بڑے ہو کر وہی عادت رہے گی۔ پس آجکل جو اکثر طلباء پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ واقع میں اپنے اوپر الزام ہے کیوں یہ نہیں کیا جاتا کہ قوم طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح رکھے مثلاً جس کے چار بچے ہیں وہ ایک طالب کو ملا کر پانچ سمجھے اور اس طالب علم کی ہر طرح امداد کیا کرے۔

علماء کی معاش کے لئے عالمگیر کی حُسنِ تدبیر

عالمگیر نے یہ کیا تھا تو ایک جماعت کی جماعت جو پریشانی میں مبتلا تھی کیسے آرام سے فارغ ہوئی اور انہوں نے کتنے بڑے بڑے کام کئے لیکن چونکہ عالمگیر رحمدلی کے ساتھ مدبّر بھی تھے ترکیب یہ کی تھی کہ طالب علموں کو جو پریشان دیکھا اور بیت المال کو بار سے بچانا چاہا تو صورت یہ کی کہ ایک امیرِ دربار سے نماز کے فرائض پوچھے تو وہ بالکل کورے تھے۔ عالمگیر نے اس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اتنے طالب علم شہر میں ہیں تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے تھوڑی دیر مسائل سیکھ لیا

کرو۔ پھر کیا تھا ہر شخص طالب علموں کا طالب ہوگیا اور اس طرح سب طالب علم لباس و تنخواہ سے بے فکر ہوگئے مگر یہ سب حکومت کے بدولت تھا کہ حکومت عجب چیز ہے۔ مگر اب اتفاق باہمی بھی اس سے زیادہ عجیب کام کرسکتا ہے جب اس کی ضرورت ثابت ہوچکی ہے تو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہئیے ۔ یہ تدبیر تو مولوی بنانے کی تھی۔

غیر مولویوں کو تعلیم دینے کا طریقہ

اب رہے وہ لوگ جو کہ مولوی نہ ہوں ان کے لئے ضروریات کی تعلیم ہونی چاہئیے خواہ اردو میں ہو یا عربی میں مگر انگریزی کے قبل ہو کیونکہ پائیدار اثر نقش اول کا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ کھولتے ہی انگریزی میں ان کو لگا دیا جائے۔ تو اول تو قرآن شریف پڑھاؤ اگر پورا نہ ہو تو دس سپارے(۱) ہی سہی اور اس کے ساتھ ہی اس کی روزانہ تلاوت کا بھی التزام رکھو اور اس کے بعد کچھ رسالے مسائل دین کے اگرچہ اردو ہی میں ہوں ان کو کسی عالم سے پڑھواؤ اس کے بعد اگر ضرورتِ معاش مجبور کرے تو انگریزی بھی پڑھاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر دین کے خلاف اس میں کوئی بات پیدا ہو تو فوراً اس کو تنبیہ کرو اور اگر باز نہ آئے تو انگریزی چھڑا دو۔

اَن پڑھ جہلاء کی تعلیم و تربیت کا طریقہ

اب رہے وہ لوگ جو کہ بالکل ہی نہیں پڑھے ان کے لئے یہ ترکیب ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں ہر ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ کسی سے مسائل اور اخلاق کی کتابیں پڑھوا کر ان کو سنوا دیں۔

---

(۱) لوگوں کو اپنی حالت پر شرم کرنا چاہیے کہ حکیم الامت مایوس ہو کر کس قدر تنزل کر کے رائے پیش کرتے ہیں۔۱۲ جامع

عورتوں کی تعلیم

اور عورتوں کے لئے یہ کیا جائے کہ جو ان میں سے پڑھ سکیں ان کو تو پڑھایا جاوے اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو ان کے مرد دینی رسالے سنادیا کریں۔ اور جن کے مرد پڑھے نہ ہو وہ خواندہ(۱) عورتوں سے سن لیا کریں۔ اور ساتھ ہی جو مسائل پیش آئیں ان کو مرد بلا واسطہ اور عورتیں بواسطہ مردوں کے علماء سے پوچھتی رہیں یہ وہ ترکیب ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوا جائے۔ تو چند ہی روز میں ساری جہالت کا خاتمہ ہوجائے گا اور تمام قوم میں دین پھیل جائے گا۔ یہ تو علم کے متعلق تھا۔

ظاہر و باطن کی اصلاح

اب تیسری چیز یُزَکِّی میں عمل ہے اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں، تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمالِ ظاہری ہیں اور ایک اعمالِ باطنی اس وقت جو لوگ عمل کرتے بھی ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر با یزید — وزدرونت ننگ میدارد یزید

''اوپر سے کافر کی قبر کی طرح مزین ہو اور نیچے اللہ کا عذاب ہے اوپر سے بایزید پر طنز کرتے ہو اور اندر سے یزید جیسا شخص شرماتا ہے''

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے جس کو کم و بیش حاصل بھی کیا جاتا ہے۔ دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں ایک تو بے التفاتی اہلِ دنیا کی، دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف(۲) کی یعنی آجکل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے۔

(۱) پڑھی لکھی عورتوں سے (۲) ان لوگوں کی بدعملی جو اپنے کو تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں اور صوفی کہلاتے ہیں۔

تصوف کی حقیقت

حقیقت تصوف کی ہے'' تعمیر الظاھر والباطن '' ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں توّکل ہو' شکر ہو' رزائل کو دور کیا ہو جیسے حبِّ دنیا وغیرہ یہ ہے تصوف' تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لئے ہوئے اور جنھوں نے باطن کو لیا انہوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کرلیا ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیہ باطن (۱)۔ بلکہ حُبِّ دنیا میں حُبِّ جاہ میں غرق (۲) ہیں اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوف سے بمراحل دور ہیں۔ غرض تصوف اصلاحِ ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال متعارفہ کا نام بھی نہیں۔ یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہوسکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور دوام ذکر پر توفیق ہورہی ہو' رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا' عرس کرنا' کپڑے رنگین پہننا' سماع سننا سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے اور احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہوجاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اس کے لوازم نہیں' اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی ان کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہوگیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں بلکہ حقیقی مقصود یہ ہے کہ حکم ہے ﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ (۳) ''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا'' جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ (۴)

(۱) نہ باطن کی اصلاح (۲) بلکہ دنیا اور اقتدار کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں (۳) سورۂ بقرہ: ۱۵۲ (۴) اللہ سے تعلق قائم ہوجائے۔

ہو جائے اور اس سے سہولت فی الطاعۃ (۱) ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوّفین کو ہوئی دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انہیں اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوالِ طبعہ کو بھی ہوتا ہے غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مبائن خارج سمجھنا بھی غلطی ہے فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے۔

اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں اس کو مفصل بیان کر چکا ہوں۔ جس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہاں رہا عمل ظاہر تو وہ ظاہر ہی ہے۔ پس یہ آیت علم و عمل کی تمام شاخوں کو جامع ہے کہ ہمارے نبی ﷺ آئیں گے اور وہ یہ اہتمام کریں گے۔

خلاصۂ وعظ

اب آپ کو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ یہ تینوں چیزیں کیسی ضروری ہیں' دوسرے یہ کہ ہمارے حضور ﷺ کیسے شفیق تھے کہ ایسی باتیں بتلائیں کہ اگر ان کو چھوڑا جائے تو دین اور دنیا سب بگڑ جائیں دین کا بگڑنا تو ظاہر ہے اور دنیا اس لئے کہ مسلمانوں کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہے کہ جب یہ دین چھوڑتے ہیں تو دنیا بھی ان سے رخصت ہو جاتی ہے۔ دوسرے دنیا نام ہے راحت کا اور دین کو چھوڑ کر راحت نصیب نہیں ہوتی۔ تو جب حضور ﷺ اتنی بڑی رحمت ہیں تو اب یہ دیکھئے کہ آپ نے حضور ﷺ کا حق کیا ادا کیا۔ دیکھو! حضور ﷺ کے تین حق ہیں ایک یہ کہ آپ کے ساتھ محبت ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کی عظمت قلب میں ہو۔ تیسرے یہ کہ آپ کی متابعت کی جائے اس وقت بعض نے عظمت کو تو لیا مگر محبت اور متابعت دونوں کو بالکل چھوڑ دیا تو بعض نے متابعت تو کی مگر محبت اور عظمت

(۱) نیکی کرنے میں سہولت ہو۔

کو چھوڑ دیا اور بعض نے محبت وعظمت دونوں کو لیا مگر متابعت چھوڑ دی۔ میں نے اس مضمون کو ''القاسم'' میں لکھدیا ہے یہ ایک ماہواری رسالہ ہے جو کہ بہت ہی مفید ہے۔ میں یہ بھی رائے دیتا ہوں کہ لوگ اس کو خریدیں اس میں اختلافی مسائل نہیں ہیں بلکہ محض متفق علیہ اصلاح ہے۔ بہرحال یہ حقوق ہیں آپ ﷺ کے۔ اور آپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں اور نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کریں اور وہ ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائیں آمین۔ (۱)

تمت

---

(۱) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ کو پڑھنے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

خلیل احمد تھانوی ۱۶ فروری ۲۰۰۸ء

سلام

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

رحمت دو جہاں شافع المذنبیں　　فخر کون و مکان شاہ دنیا و دیں
وہ کتاب ہدایت کی شرح مبیں　　کائنات دو عالم کا درِّ ثمیں

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

وہ خدا کی ہدایت کا پیغامبر　　امتی جس کے ہیں سارے جن و بشر
دائرہ جس کی دعوت کا کل بحرو بر　　جس کے آگے مسخّر ہیں شمس و قمر

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

بے کسوں اور یتیموں کا والی وہی　　کائنات دو عالم میں عالی وہی
شان جس کی ہے سب سے نرالی وہی　　ہر دکھے دل کا ہے غم گسالی وہی

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

زخم کھا کر دعا کرنے والا وہی دشمنوں کو رہا کرنے والا وہی
بے وفا سے وفا کرنے والا وہی رحم کی التجا کرنے والا وہی

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

آخری جس پہ رب کی وحی آئی ہے جس کی عظمت کی رب نے قسم کھائی ہے
جس کو معراج خود رب نے کروائی ہے انبیاء کی امامت بھی فرمائی ہے

احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

ہے یہ عارف اک ادنیٰ غلام آپ کا نام لیتا ہے یہ صبح و شام آپ کا
امتی ہے پراگندہ کام آپ کا اس پہ ہوجائے اب فیض عام آپ کا
احمد مجتبیٰ پر درود و سلام
خاتم الانبیاء پر درود و سلام

حضرت مولانا مشرف علی عارف تھانوی مدظلہ العالی
شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

بالیقین تیرا مدّاح قرآن ہے حکم رب العلٰی تیرا فرمان ہے
تو ہے بعد از خدا سب سے عالی مقام تیری عظمت پہ یہ میرا ایمان ہے

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

تو میری روح ہے تو میری جان ہے تیری الفت تو معیارِ ایمان ہے
پیکر حسن ہے خُلق قرآن ہے تو سب سے اعلیٰ وارفع تیری شان ہے

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

تیری آمد سے جگ میں اجالا ہوا تجھ سے توحید کا بول بالا ہوا
غیر اپنے ہوئے تیرے اخلاق سے دشمنی کا دلوں سے نکالا ہوا

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

جو نہ تھے راہ پر مقتدا بن گئے جو ڈبونے چلے ناخدا بن گئے
کس نے مُردوں کو آکر مسیحا کیا جو تھے اعدائے دیں باخدا بن گئے

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

تو خلیفہ خدا کا ہے اک ذی وقار تیری مسند کے وارث ہیں حق چار یار
معتمد ہے تو اللہ کا بالیقین تجھ کو بھی اپنے یاروں پہ ہے اعتبار

خاتم الانبیاء خاتم المرسلین
فخر کون و مکاں شاہ دنیا و دین

حضرت مولانا مشرف علی عارف تھانوی مدظلہ العالی
شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور